انشائے لطیف بنام پروفیسر نظیر صدیقی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

“Inshay Latif”, Letter sent to Prof. Nazir Siddiqui: Research and Critical Review

منیبہ زہرا نقوی[i] ڈاکٹر عبدالعزیز ملک[ii] ڈاکٹر سمیرا ملک[iii]

Abstract:

The letters being addressed to Professor Nazir Siddiqui, included in the first volume of 'Insha e latif', is not the sheer conversation between two intimate friends or counter arguments only but the dialogue between two stalwarts of literature also. It encompasses such a valuable evaluation of academic, literary, social and intellectual framework of that era which depicts the prevalent literary and critical trends too. The article under review highlights the historical significance of this correspondence which is food for thought and opens the vistas for the inquisitive venturers of research in the field of literature.

Keywords: *Professor Nazir Siddiqui, Insha e latif, Letters, dialogue, literature, Latif uz Zaman Khan.*

لطیف الزّماں خاں کے پروفیسر نظیر صدیقی کو لکھے گئے انشائے لطیف جلد اوّل میں شامل خطوط محض دو دوستوں کے مابین گفتگو یا بحث برائے بحث نہیں بلکہ یہ دو ادب شناسوں کے درمیان ایسے علمی ، ادبی ، فکری اور تہذیبی و معاشرتی مکالمے ہیں کہ جن سے ایک عہد ایک فکر اور ادب کے رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ خطوط اپنے پیرائیہ اظہار میں ادب شناسوں کو دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔ مذکورہ مضمون ان خطوط کو سمجھنے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو گا۔

کلیدی الفاظ: پروفیسر نظیر صدیقی ، انشائے لطیف ، خطوط ، مکالمہ ، ادب ، لطیف الزماں خان۔

لطیف الزّماں خاں کے پروفیسر نظیر صدیقی کو لکھے گئے خطوط ”انشائے لطیف“ (جلد اوّل) میں شامل ہیں۔ نظیر صدیقی اُردو اور انگریزی کے صاحبِ طرز ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ بیس سے زائد کتب کے مصنف تھے۔ اُنھوں نے کالم، انشایئے اور خاکہ نگاری پر بھی طبع آزمائی کی۔ لطیف الزّماں خاں سے اُن کی رفاقت ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ اس رفاقت پر مشتمل اُن کے خطوط، ”انشائے لطیف“ (جلد اوّل) میں موجود ہیں۔ ان خطوط کی کل تعداد جو ”انشائے لطیف“ (جلد اوّل) میں شامل ہیں؛ تین سو بارہ (۳۱۲) ہے۔ یہ خطوط، دو ادیبوں کی ادبی زندگی کے آئینہ دار بھی ہیں اور دو دوستوں کے رنج و غم کا تذکرہ بھی ہیں۔ یہ خوشیوں کے رنگوں کی قوسِ قزح بھی دکھاتے ہیں اور ایک یارِ مہرباں کی نم آنکھوں سے آنسو پونچھتے بھی نظر آتے ہیں۔ ان خطوط میں پاک و ہند کے ادبی مباحث کا تذکرہ بھی ہے۔ کم حوصلگی اور حوصلہ بھی ہے۔ صرف نظیر صدیقی کے خطوط کے پیرایے میں اگر لطیف الزّماں خاں کے خطوط میں شامل مضامین اور خیالات کا

[i] اسسٹنٹ پروفیسر(اردو)، گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج برائے خواتین ، سرگودھا۔ (Corresponding Author)
[ii] اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبہ اردو ، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی ، فیصل آباد۔
[iii] اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبہ اردو ، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی ، فیصل آباد۔

تجزیہ کیا جائے تو بجائے خود یہ خطوط طویل علمی و فکری مباحث پر مشتمل ہیں۔ ان خطوط میں سیاست اور سیاست کی بدلتی صورتِ حال، ملک کو درپیش مسائل، معاشرتی المیے، ایک فرد کی پریشانیاں، ایک ادیب، ایک استاد کی زندگی میں درپیش مسائل، معاشرے کی جانب سے ناقدری، ناقدر شناس لوگوں کا اونچی مسندوں تک پہنچنے کا قصہ، معاشرتی شعور کا فقدان، شاعری اور شعرا کے مقام و مرتبے کی غلط تفہیم، دو دوستوں کی باہم محبت، خفگی، تکرار، دلائل، کبھی محبت، کبھی ہمدردی اور کبھی بے توجہی غرض یہ کہ ہر بدلتی صورتِ حال اور ہر رنگ ان خطوط میں جا بجا بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔

لطیف الزّماں خاں، نظیر صدیقی سے ہر بات پوچھتے اور ہر بات بتاتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ملکی صورتِ حال، بدلتے ہوئے رشتوں، نفسا نفسی کی فضا کو دیکھ کر دکھی بھی ہوتے ہیں اور اس دکھ کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنا کتھارسس بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ مشرقی پاکستان سے آنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہو کر بتاتے ہیں کہ وہاں سے آنے والوں پر تو مدت سے دروازے بند ہو چکے ہیں اور کچھ روز قبل اخبارات میں یہ پڑھا کہ اُردو بولنے والوں کے لیے وہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انھیں کسی جزیرے میں بسا دیا جائے، تعصّب کی لعنت دیکھیے کہ اب کیا رنگ لائے گی۔[۱] آج کا پاکستان ہو یا لطیف الزّماں خاں کے خطوط میں شامل ۱۹۷۳ء کے ملکی حالات کا تذکرہ، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا قلم موجودہ حالات کی منظر کشی کر رہا ہے:

> ''یہ اطلاع غلط ہے کہ سیلاب کا پانی گلگشت تک پہنچا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ خطرہ کے پیش نظر ۱۴ اگست کو سوا تین بجے ریڈیو سے یہ اعلان ہوا تھا کہ گلگشت، ممتاز آباد اور شمس آباد کے لوگ محفوظ مقامات پر چلے جائیں۔ اہل ملتان بالکل محفوظ رہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ملتان کے ارد گرد دیہات بہہ گئے۔ نام و نشان تک مٹ گیا۔ پشتوں کا اثاثہ غارت ہو گیا۔ گندم پر ہی کیا منحصر ہے سوائے جسم کے کپڑوں کے ہر چیز بہہ گئی۔ جو بچ نکلے عوارض کا شکار ہیں اور ایسی دربدری ہے کہ الاماں۔ کسان جو اس ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہے اس کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہے۔ تاجر پیشہ طبقہ نے اقبال کے قول کو صحیح ثابت کیا''یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کر شرمائیں یہود''۔ گرانی یوں بڑھ رہی ہے جیسے چیونٹیوں کی تعداد بڑھتی ہے۔ چیزیں کم یاب اور بعض چیزیں نایاب ہیں اور جو ملتی ہیں وہ عام انسان کی دسترس سے باہر ہیں۔ اب رمضان آ رہا ہے یعنی مسلمان تاجر کو لائسنس مل جائے گا کہ جس چیز کا

جو چاہے دام لگائے۔" [۲]

انسانی زندگی میں روز نئے واقعات، نئے حادثات، نئی تبدیلیاں اور انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ یہ انقلابات، یہی تبدیلیاں اور یہی واقعات نسلِ انسانی کی تمدنی، معاشی و معاشرتی تاریخ مرتّب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لطیف الزّماں خاں کے ان خطوط میں بہت سے واقعات کا تذکرہ ملتا ہے جو سیاست، معاشرت، تہذیب اور تمدن کے آئینہ دار ہیں۔ یہ واقعات بیک وقت اُس عہد کی تاریخ کے ساتھ ساتھ مکتوب نگار کے قلم سے اُس ماحول کی تاریخ بھی مرتّب کر رہے ہوتے ہیں، جس ماحول میں وہ زندگی کے شب و روز گزار رہا ہوتا ہے۔ سرکاری ترقیوں کے سلسلے میں کتنی اور کیسی کیسی خواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لطیف الزّماں کے قلم سے اُس بیان میں وہی رنگِ ملامت ہے کہ جو آج بھی سرکاری ملازمین کو درپیش ہے:

"جی ہاں نوٹیفیکیشن ہو گیا۔ فہرست میں میرا نمبر ۱۷ ہے، اگر کسی اسلامیہ کالج میں ہوتا تو آج گریڈ ۱۹ میں ہوتا۔ کیا غضب ہے جن کی مدتِ ملازمت سات سال ہے، وہ کب کے ترقی پا کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے اور کون لوگ، جو پبلک سروس کمیشن سے کبھی approve نہیں ہو سکتے تھے۔ جو سو روپیہ لے کر چار سو دستخط کرتے تھے۔ جو تین تین مضامین پڑھاتے تھے اور شام کو کسی قریشی، کسی گیلانی یا کسی مخدوم کے صاحبزادوں کو پڑھاتے اور صبح ان کے گھر کی سبزی گوشت لاتے تھے۔ ہم نے اٹھارہ سال جھک مارا اور آپ مبارک باد دے رہے ہیں۔" [۳]

لطیف الزّماں خاں کو منظر نگاری اور مرقّع نگاری میں کمال حاصل ہے اُن کے اکثر مکتوبات میں گردو پیش کا تجزیہ اور منظر کشی اس رنگ میں کی گئی ہے کہ مناظر، ماحول اور شخصیات کی ایک واضح تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ تصویر اتنی جاندار اور اس منظر نگاری کے رنگ ایسے بلیغ ہیں کہ قاری تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول جاتا ہے کہ وہ لطیف الزّماں خاں کے خطوط پڑھ رہا ہے۔ خاکہ نگاری اور منظر نگاری کا یہ لطف اکثر خطوط میں جا بجا ملتا ہے اور ان مکتوبات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قلم میں بلا کی تاثیر اور اُن کے لفظوں میں بلا کی جاذبیّت کے رنگ پنہاں ہیں۔ نظیر صدیقی کے نام اپنے ایک خط میں وہ کراچی سے واپسی کے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے کچھ ایسے مناظر اور رنگوں سے روشناس کرواتے ہیں جن میں تہذیب، ثقافت اور اقدار کا رنگ نمایاں ہے:

''میں ۳ مئی کو صبح سات بجے کراچی سے روانہ ہوا۔ دن کو ساڑھے بارہ بجے روہڑی پر ٹرین کھڑی ہو گئی اور چھ گھنٹے سے زیادہ کھڑی رہی۔ دھوپ، حبس اور تپش، اسٹیشن پر ٹھنڈا پانی ذرا سی دیر میں غائب ہو گیا۔ ڈاڑھیاں بھگوئی گئیں پھر چوخانے کے رومال اس طرح ترکیے گئے کہ پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور گھٹی ہوئی چندیا پر انھیں رکھا جا رہا تھا۔ دو خدائی فوجداروں نے ٹھنڈے پانی کے کولر کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ نل کا میلا پانی مجھ جیسے لوگوں کے لیے تھا۔ لوگ کپڑوں سمیت نہا رہے تھے۔'' [۴]

لطیف الزّماں خاں نے اسی خط میں مسلمان خوانچہ فروشوں کی تاجرانہ روش کو جس رنگ میں بیان کیا ہے وہی رنگ احسان دانش کی خود نوشت ''جہانِ دانش'' میں ملتا ہے، جس میں وہ بڑے کرب سے لکھتے ہیں کہ مسلمان تاجروں کی نظر میں آج حق و صداقت کا معیار اور اخلاقی اقدار کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی بلکہ یہ قدریں صرف بیان کی چیزیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ کون سا تاجر ایسا ہے کہ جو تجارت کو سنتِ پیغمبر سمجھ کر کرتا ہے، یہ تو سارقانہ ہیر پھیر اور مجرمانہ ہتھکنڈوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ [۵] لطیف الزّماں خاں کا دکھ بھی اسی نوعیّت کا ہے:

''مسلمان خوانچہ فروشوں کی تاجرانہ حس بیدار ہوئی۔ شروع میں کنو دس روپے سیر تھا، بیس روپے ہو گیا۔ ہر شے گراں ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی۔ مغرب سے ذرا قبل ٹرین چلی پھر کھڑی ہو گئی پھر چلی۔'' [۶]

خط نگاری کے سلسلے میں یقیناً اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خط ایسا ہونا چاہیے کہ جو پیغام کا قطعی ابلاغ اپنے متن میں رکھتا ہو [۷] یعنی خط نگار جس مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی بات بذریعہ خط کرنا چاہ رہا ہے، وہ بات بھی مکمل ہو جائے اور بعد ازاں یہ خط اپنے اسلوب کی بنا پر کسی بھی پڑھنے والے کے لیے، مسرت انگیز ثابت ہو تو یقیناً ایسے خطوط اُردو ادب میں اپنا مقام متعین کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی رائے اس حوالے سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ خط نگاری پر بات کرتے ہوئے وہ کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''خط نگاری ادب کے دوسرے شعبوں کے برعکس اصلاً ادب نہیں بلکہ محض ایک ضروری اور افادی عمل ہے۔ خط نگاری خود ادب نہیں، مگر جب اس کو خاص ماحول، خاص مزاج،

خاص استعداد اور خاص فضا میسر آ جائے تو یہ ادب بن سکتی ہے مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے، یہ شیشہ گری ہے، اس سے بھی نازک تر، اور پھر آئینہ ساز ہو کر بھی بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو سچ مچ ایسا آئینہ ڈھال سکیں جس کے جلوے خود تقاضائے نگاہ بن جائیں۔"[۸]

نظیر صدیقی کے نام اُن کے لکھے گئے خطوط اہم ادبی مباحث اور فکر انگیز مضامین پر مشتمل ہیں۔ یہ خطوط محض دو بے تکلف دوستوں کے مابین بات برائے بات نہیں بلکہ دو ادب شناسوں کی ادبیّت کے آئینہ دار ہیں۔ وہ نظیر صدیقی سے دل کی بات بھی کھل کر کرتے ہیں اور ادیبوں اور اُردو ادب پر بھی بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ لطیف الزّماں خاں کے فکری روّیوں اور اس کا بلا تکلف اظہار ان کے دیباچوں، تبصروں میں بالعموم اور ان کے خطوط میں بالخصوص اپنی جھلک دکھانے لگتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ خط لکھتے ہوئے مکتوب نگار کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں نہیں ہوتا کہ کل ضرور انھیں اکٹھا کیا جائے گا اور زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جائے گا۔ خط انسان کے ذاتی خیالات کا بلا تکلف اظہار ہوا کرتا ہے۔ اس اسلوب کے حوالے سے کسی مخصوص ادبی رجحان، کسی دبستانِ فکر کی پیروی ضروری نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے فکری رویوں کی غمازی بھی بخوبی کرتے ہیں۔ وہ خواہ غالب کے خطوط میں ان کی فکری لطافت ہو، رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی تاثیر ہو یا لطیف الزّماں خاں کے خطوط میں موجود اُن کی نشتر آمیز تنقیدی بصیرت ہو، سبھی قاری کے سامنے مکتوبات کے پیرایے میں بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری، پروفیسر احتشام حسین اور ترقی پسند ادب کی اہمیت و فوقیت کو بیان کرتے ہوئے وہ دلیل سے قائل کرتے دکھائی دیتے ہیں:

"شاعری یا ادب میں صرف وہی بات زندہ رہتی ہے جو ایک جانب فرد کے احساسات اور ادراک کو یوں بیان کرے کہ پڑھنے والا اُسے محسوس کرے کہ یہ اس کا حالِ دل ہے۔ دوسری جانب وہ اس شعور کو بیان کرے جو اجتماعی ہے۔ فراق صاحب کو اپنی بات کہنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن مجھے بھی اپنی رائے اور اس کے اظہار کا حق ملنا چاہیے۔ آپ ترقی پسند ادب کے بیشتر حصہ کو پنچائتی ادب کہہ لیں اور فراق صاحب کی بیساکھی استعمال کر لیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ ترقی پسند ادب کا وہ حصہ ایسا بھی ہے جو قیامت تک نہیں مٹے گا۔ آپ دُرّے مار لیں تب بھی نہیں مٹے گا۔ تنقید کی عمارت کو آپ ڈھا دیں تب بھی

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

اس کے ملبہ سے ترقی پسند ناقد بولتا نظر آئے گا۔ مجنوں اور احتشام حسین کو سامنے سے ہٹانے کے لیے کسی سورما کو پیدا کر لیجیے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں پچھاڑ سکے گا۔" [۹]

لطیف الزّماں خاں اُردو ادب کے مختلف رجحانات، شخصیات، ناولوں اور شعراء پر بات کرتے ہوئے تقابلی موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ کبھی وہ ایک منجھے ہوئے لکھاری کی مانند بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔ کبھی ایک بہترین استاد کی مانند مدلل و مربوط گفتگو کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ جس نظریے، شاعر یا جس ادبی تحریک سے خود متاثر ہوں دوسرے کو بھی اُسی لَے کے ہم آہنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ نظیر صدیقی سے گفتگو کرتے ہوئے وہ ادب اور ہر ادبی روّیے اور تحریک کو زیر بحث لاتے ہیں اور ایک نقاد اور محقق کی مانند عمیق نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بحث کرتے چلے جاتے ہیں۔ جدیدیت پر بات کرتے ہوئے اُن کا انداز بڑا مدلل نظر آتا ہے:

"جدیدیت ہر قسم کے جبر کو رد کرتی ہے۔ یہ جبر سیاسی ہو یا اقتصادی۔ جبر جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو جدیدیت علامت اور استعارہ کا روپ دھار لیتی ہے، اداسی، بیزاری اور Indifference جب حد سے گزر جائے تو جدیدیت احتجاج میں ڈھل جاتی ہے۔ غالب کے اشعار کو عبدالرحمٰن چغتائی نے مغل پینٹنگ کے روپ میں دیکھا لیکن صادقین نے غالب کے اشعار کو جس طرح پینٹ کیا ہے وہ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۹ء کے ہر جبر کو جو اس زمانہ میں رہا پیش کیا ہے۔" [۱۰]

لطیف الزّماں خاں نے نظیر صدیقی کو جو خطوط لکھے ہیں۔ ادبی و علمی اعتبار سے اُن کی اہمیت اِس لحاظ سے دوچند ہو جاتی ہے کہ وہ ان خطوط میں مختلف ناولوں، شخصیات اور معاشرتی رویوں کی بڑی خوبصورت منظر نگاری کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ خطوط کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ادبی و علمی مطالعے کی حیثیت سے خطوط کی اہمیت اِس پر منحصر ہے کہ ان کا کاتب کون ہے اور مکتوب الیہ کون؟ اس لحاظ سے خط کا فن ایک شخصی فن ہونے کے علاوہ شخصیتوں کا فن بھی بن جاتا ہے۔" [۱۱]

لطیف الزّماں خاں کے نظیر صدیقی کو لکھے گئے خطوط ایسی پُر مغز ادبی بحثوں سے سرشار ہیں کہ

جن کا بغور مطالعہ ادب کے ایک عہد کے مطالعے سے مربوط ہے۔ ''ایسی بلندی، ایسی پستی'' پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تغیر پذیر معاشرہ، ہندوستان کی سیاسی و معاشرتی تبدیلیاں اور انگریز کی آمد و حکومت کے بعد ہندوستان جس طرح آہستہ آہستہ نئی معاشرت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی تصویر اس ناول کا عنوان بنتا ہے۔ کردار نگاری بڑی نیچرل ہے۔ جذبات نگاری بے مثال ہے، عزیز احمد کا انسانی نفسیات کا مطالعہ بڑا گہرا ہے۔'' [۱۲]

لطیف الزّماں خاں ہمارے ادبی معاشرتی رویوں کو بنظرِ غائر دیکھتے ہیں۔ انھیں اس بات کا رنج ہے کہ پاکستان میں قرۃ العین حیدر کو سمجھا ہی نہ جا سکا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں ادب شناسوں کی ایک کھیپ ہے جو اپنے طور پر ادب پاروں کی تفہیم کرتی ہے۔ یہ نام نہاد ادب شناس، شعور اور ادب سے عاری لوگ ہیں مگر ادب کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی ہرزہ سرائی سے تنگ آ کر قرۃ العین حیدر پاکستان سے واپس چلی گئیں:

> ''۱۹۵۹ء میں ''آگ کا دریا'' چھپا تو مولویوں نے اودھم مچایا۔ طوفان کھڑا کر لیا۔ قرۃ العین حیدر لندن گئیں۔ جواہر لال نہرو سے ملیں اور ہندوستان چلی گئیں، ہم نے اس ادب پارہ کی قدر نہ کی۔ ناقدینِ ادب نے ناول کے بارے میں نہیں لکھا۔ اس کے ڈکشن، تھیم، اسٹائل پر کچھ نہیں لکھا۔ اس لیے کہ ہم تو کسی کے کام کی قدر نہیں کرتے۔ عبد اللہ حسین نے کہا کہ قرۃ العین حیدر تو ناول نگار ہی نہیں ہے اور اس کے افسانوں اور ناول سے جملے اور پیراگراف تک ''اُداس نسلیں'' میں نقل کر لیے۔'' [۱۳]

قرۃ العین حیدر کے ناولوں پہ تبصرہ ان کے خطوط میں بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی کو خط لکھتے ہوئے وہ تبصرہ بھی کرتے ہیں اور تنقید کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عبد اللہ حسین نے شعوری کوشش کی ہے کہ قرۃ العین حیدر کا اسلوب اپنائیں مگر ناکام رہے۔ بلکہ انھوں نے یہ زیادتی بھی کی ہے کہ مس حیدر کے ناول اور افسانوں کے پیراگرافز اور سطور تک اڑا لی ہیں۔۔۔۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر گفتگو کرنے سے قبل یہ کہنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ Stream Of Consciousness کو صحیح طریقے سے جانے

بغیر ان کے ناولوں سے لطف اندوز ہونا ممکن نہیں۔ "آگ کا دریا" تو اُس روح کی داستان ہے جو ہزارہا سال تک ہندوستان میں پرورش پاتی رہی۔۔۔۔ ڈھائی ہزار سال کی قدیم تہذیبی تاریخ کو اس ناول میں سمویا گیا ہے۔ اہم کردار گوتم نیلمبر، سرل اور کمال اصل میں تین عہد اور تین تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔۔۔۔ تینوں کرداروں کے زندگی کے حالات میں دراصل ہندوستان کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ مختلف قومیں اور ادوار اقوام کی مذہبی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول کے ابتدائی دو سو صفحات حسنِ بیان کی روشن ترین مثال ہے۔" [۱۴]

لطیف الزّماں خاں کا نظیر صدیقی کو لکھا گیا یہ خط قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے طویل تجزیے اور اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ اس خط کے تحقیقی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کو وہ بخوبی سمجھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ اس حوالے سے بہترین تجزیے پر مشتمل ہے۔ یہ خط نہ صرف قرۃ العین حیدر کے ادبی کام کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے بلکہ دیگر افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔

"راجہ گدِھ" پر اُن کا تجزیہ مکمل تنقیدی شعور کی غمازی کرتا ہے۔ اس تبصرے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب پارے کا محض سرسری جائزہ نہیں لیتے بلکہ وہ مکمل تحقیقی شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک تجزیاتی پیرایے میں ناول یا افسانے یا ادب پارے کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان خطوط میں اپنے دوست کے ساتھ اُن کا یہ تبادلۂ خیال جہاں ایک طرف ان کی فہم و بصیرت کا آئینہ دار ہے، وہیں اس بات کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ وہ جس ادب پارے کا جائزہ لیتے ہیں۔ اپنے دوست، احباب اور ادب شناسوں کو اُس سے آگاہ کرتے ہیں۔ اُن کے خطوط کا قاری نہ صرف ان مکتوبات کے اسلوب میں گم ہو جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ادبی، تحقیقی و تنقیدی شعور کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔

لطیف الزّماں خاں کے خطوط میں دکھ اور درد کی باتوں کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے۔ "ظہور نظر" کے جنازے کی جس طرح بے حرمتی کی گئی اور اس کے انتقال کے بعد تمام مساجد میں اعلان کیا گیا کہ وہ کمیونسٹ تھا، اس کی نمازِ جنازہ کوئی نہ پڑھائے کہ وہ جائز ہی نہیں۔ [۱۵] لطیف الزّماں خاں اُس دکھ کو محسوس کرتے اور اُس کرب کو بیان کرتے ہوئے دُعا گو نظر آتے ہیں کہ مولوی کی تنگ نظری اور کم ظرفی سے اللہ محفوظ

رکھے۔ جوش ملیح آبادی سے اُن کی عقیدت ان کے شاعرانہ محاسن کی وجہ سے بے انتہا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگتے ہیں، جب وہ ساتویں یا چھٹی جماعت کے طالب علم تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک مشاعرہ سنا تھا۔[۱۶] لطیف الزّماں خاں اُس مشاعرے میں سنے گئے جوشؔ کے اشعار لکھتے ہوئے جہاں ایک طرف جوش کی قادر الکلامی سے آگاہ کرتے ہیں وہیں اپنی بے مثال قوتِ حافظہ کا پتا بھی دیتے ہیں:

تجھ کو یقین نہ آئے گا اے دائمی غلام — میں مقبروں میں جاکے سناؤں گا اگر کلام
خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں — قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں
تو چپ رہا، زمین ہلی، آسماں ہلا! — تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلا
اِن مہ وشوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں؟ — نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا کیوں؟

وہ جری انسان جو انگریز کو للکارتا رہا اور ہر گز نہ ڈرا، اب خاموش ہو گیا تھا۔"[۱۷]

جوش ملیح آبادی کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اُس دکھ کا اظہار کر رہے کہ ایسے قادر الکلام شاعر کی ناقدری کی گئی، کم ظرف لوگوں نے اُن کے حوالے سے لغو اور بیہودہ گوئی کی، اور پھر جنازے کے حوالے سے جس طرح کی صورتِ حال سامنے آئی؛ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے لطیف الزّماں خاں کا دُکھ دوچند ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے اُن کے خط کا یہ اقتباس ہمارے معاشرتی رویوں کے ایک اور چہرے سے پردہ اُٹھاتا ہے:

"کوثر نیازی صاحب اور پیر دیول صاحب دونوں ہی سیاسی انسان ہیں۔ اگر وہ جوش صاحب کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے بجائے شہر سے غائب ہو گئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اوّل تو مولوی اور سیاسی مولوی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ سیّد فیضی صاحب نے بڑا کرم کیا کہ فقہ جعفریہ کے مطابق بھی نماز ادا کر دی گئی۔ اگر وہ یہ اصرار فرماتے کہ ان کی تدفین اہلِ سنت کے طریقہ پہ ہونے کے بعد فقہ جعفریہ کے مطابق ہو تو خدا جانے جوش صاحب کی لاش کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ سوا سو لوگ جنازہ میں شریک ہوئے۔ اسے بھی اللہ کا کرم ہی سمجھئے۔ اسلام آباد میں مشاہیر ہوتے ہی نہ ہوں گے تو شریک کہاں سے ہوتے۔"[۱۸]

لطیف الزّماں خاں کے ان خطوط کو پڑھنے سے اور ان واقعات کا مطالعہ کرنے سے ایک عہد کی تاریخ مرتّب ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس میں لوگوں کے روز بہ روز بدلتے روّیے، فکر کی نئی راہیں، مولوی اور

مُلّا کی انتہا پسندی، معاشرتی ناقدری کا شکار افراد، حق دار کی حق تلفی، غرض زندگی میں بکھرے ہوئے بے شمار واقعات ان خطوط کے پیرایے میں ایک تاریخ مرتّب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لطیف الزّماں خاں مذہب کے بارے میں متعصبانہ روّیے کے قائل نہیں۔ وہ شیعہ سنّی اختلافات کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں مسلک کے بارے میں انتہا پسندی دراصل روشن خیالی کو ترک کرکے تنگ نظری کے راستے پر چلنے کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کے حالات اور اس خطے کی مجموعی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ ایک حساس ادیب اور زود رنج انسان کی صورت تبصرہ کرتے ہوئے نظیر صدیقی سے اس دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ جس دکھ سے اِس خطّے کے عوام دوچار ہیں۔ وہ اُس صورتِ حال کو دکھ کی نظر سے دیکھتے ہیں، جس سے ہندوستان کے مسلمان دوچار ہیں، لیکن انھیں یہ بھی علم ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہرگز غیر متوقع نہیں ہے۔ وہ نظیر صدیقی سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ کی طرح میں بھی بالخصوص یہاں کے حالات اور بالعموم پورے برِّ صغیر کے مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس ہوں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب تباہی کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا سلسلہ تو اُسی وقت شروع ہو گیا تھا، جب ابھی پاکستان معرضِ وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ ہندوستان میں ہندوستانی اُس روٹی کی قیمت ادا کر رہا ہے، جو یہاں کا مسلمان کھا رہا ہے۔ لطیف الزّماں خاں اسی حوالے سے مزید بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ وہاں ہونے والی درندگی اور وحشت پہ اتنا غور نہ کیجیے کہ وہ تو ان کا مقدّر بن گئی ہے۔ البتہ پاکستان میں مذہب کے نام جو شیعہ اور سُنّی کنونشن ہو رہے ہیں ان پر غور کیجیے۔ تعصّب کی لعنت پورے معاشرے میں خطرناک حد تک پھیل چکی ہے۔ جناح کے ساتھ ہر مذہب اور ہر مسلک کا انسان تھا، لیکن کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُن کی زبان سے کبھی کوئی متعصبانہ لفظ یا جملہ نکلا تھا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جب روشن خیالی کو ترک کرکے تنگ نظری اور ملّائیّت کی راہ کو چنا گیا ہے تو اس کے نتائج کیسے تباہ کن ہیں۔ ایسی انتہا پسندی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لطیف الزّماں خاں لکھتے ہیں کہ یہ پاگل پن اور مذہبی جنون کی راہ ہے۔ جس طرح بہ جبر افرادِ معاشرہ کو مذہب کے نام پر انتہا پسندی کی نظر کیا جارہا ہے، اس کے نتائج انتہائی خوف ناک ہوں گے۔ [۱۹]

ایک اور اہم موضوع جو لطیف الزّماں خاں کے نظیر صدیقی کو لکھے گئے خطوط میں سامنے آتا ہے،

وہ نظیر صدیقی کی کتب کی طباعت کے سلسلے میں لطیف الزّماں خاں کی دلچسپی، اُن کی کوششیں، تفکرات اور خلوص ہے۔ یہ خلوص اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اس باہم خط وکتابت میں دو دوستوں کی محبت بھی ہے، خفگی بھی، روٹھنے اور منانے کے رنگ بھی ہیں اور دلچسپ تکرار بھی ہے۔ جب کسی خط میں نظیر صدیقی نے یہ لکھا کہ میں مفلوکُ الحال ہوں تو لطیف الزّماں خاں بے قرار ہو اُٹھے۔ اُن کا خلوص اُن کے لفظوں سے چھلک رہا ہے۔ نظیر صدیقی کو اس خط کا جواب دیتے ہوئے "ہاتھ رکھ دیتی ہیں دل پہ تیری باتیں اکثر" کے مصداق وہ تسلی، تشفّی کے ساتھ ساتھ اُس دکھ کا مداوا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں جس سے نظیر صدیقی صاحب گزر رہے ہیں۔ گیارہ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو لکھے گئے اس خط میں وہ خلوص کی انتہا کا مظاہرہ کرتے ہیں:

> "جس جملے نے مجھے بے قرار کیا وہ یہ ہے "خدا کی قسم مفلوکُ الحال ہونے کے باوجود مجھے کتابوں کے معاوضے سے اتنی دلچسپی نہیں، جتنی کتابوں کے چھپ جانے اور محفوظ ہو جانے سے"۔ لفظ "مفلوکُ الحال" نے تو جیسے میرے سینے میں اَنی اتار دی۔ افضل صاحب نہ چھاپیں، کوئی اور پبلشر نہ چھاپے میں آپ کی کتابیں چھپواؤں گا۔ میں نے مکان کے لیے روپیہ لیا۔ اس پر زکوٰۃ کٹ گئی۔ اب وہ بینک میں ہے اور زکوٰۃ کٹ جائے گی اور ایک دن میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ کی کتابیں چھپیں۔"[۲۰]

یہ خط محض دو دوستوں کی باہمی گفتگو نہیں، بلکہ یہ دو ادب شناس دوستوں کی باہم محبت اور خلوص کی وہ قابلِ تقلید مثال ہے جو فی زمانہ خال خال ہی نظر آتی ہے۔ یہ خط ایک طرح سے ترغیب کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ وہ ترغیب جو دوستی اور رفاقت نبھانے پر اکساتی ہے۔ وہ ترغیب جو ہر طرح کے لالچ، حسد اور کینے سے پاک رہنے کا عندیہ دیتی ہے۔ یہ دو دوستوں کے ایک دوسرے کے لیے خلوص اور اعتماد کی بات ہے۔ جس خلوص کی ہر اُس دور کو ضرورت رہے گی جس دور یا جس زمانے سے خلوص اور اعتماد جاتا رہے گا۔

لطیف الزّماں خاں کے نظیر صدیقی کو لکھے گئے خطوط کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ دونوں کے مابین ادب واحترام پر مبنی رفاقت اور خلوص کا ایسا رشتہ قائم تھا کہ جس کی بدولت، رنجش، خفگی، پریشانی اور زندگی میں درپیش گوناگوں مسائل کے باوجود دونوں قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ دونوں کے مابین ادبی اور علمی مباحث نے باہم اُن کی توانائیوں کو قائم ودائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اِن خطوط کے پیرایے میں بہت سے تاریخی، ادبی اور تہذیبی رنگوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام نظیر صدیقی'' مشمولہ انشائے لطیف (خطوطِ لطیف الزّماں خاں بنام نظیر صدیقی)، مرتّبہ: ڈاکٹر عارف ثاقب (ملتان: ملتان آرٹس فورم، ۲۰۰۷ء)، ۴۴۔

۲۔ ایضاً، ۴۴۔

۳۔ ایضاً، ۱۳۲۔

۴۔ ایضاً، ۵۱۴۔

۵۔ احسان دانش، جہانِ دانش (کراچی: المسلم پبلشرز، اُردو بازار، ۱۹۹۵ء)، ۶۳۹۔

۶۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام نظیر صدیقی'' مشمولہ انشائے لطیف (خطوطِ لطیف الزّماں خاں بنام نظیر صدیقی)، ۵۱۵۔

۷۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، میر امن سے عبد الحق تک (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۶۵ء)، ۲۷۰۔

۸۔ ایضاً، ۲۶۹۔

۹۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام نظیر صدیقی''، مشمولہ انشائے لطیف (خطوطِ لطیف الزّماں خاں بنام نظیر صدیقی)، ۴۲۱۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، میر امن سے عبد الحق تک، ۲۶۸-۲۶۹۔

۱۲۔ لطیف الزّماں خاں، ''مکتوب بنام نظیر صدیقی''، مشمولہ انشائے لطیف (خطوطِ لطیف الزّماں خاں بنام نظیر صدیقی)، ۴۲۱۔

۱۳۔ ایضاً، ۳۷۰۔

۱۴۔ ایضاً، ۲۲۴۔

۱۵۔ ایضاً، ۳۱۶۔

۱۶۔ ایضاً، ۳۳۶۔

۱۷۔ ایضاً، ۳۳۶۔

۱۸۔ ایضاً، ۳۴۲۔

۱۹۔ ایضاً، ۲۲۹۔

۲۰۔ ایضاً، ۲۳۹۔